ایاز بیگ اپنے بھاری، تھکے جسم کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اور تھوڑی دیر تک وہ دروازے میں کھڑے چھت کے اوپر خلا میں دیکھتے رہے۔ نعیم نے دور سے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ مگر جب وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نزدیک آئے اور اپنا بوڑھا، پھیلا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا تو وہ مڑا اور سب لوگوں کے درمیان ان سے لپٹ کر رونے لگا۔

(۱۷)

نعیم کو گاؤں میں رہتے ہوئے چند مہینے ہو چکے تھے۔ اس نے دو جوڑی بیل اور خرید لئے تھے اور اپنے باپ کی، اپنی اور ایاز بیگ کی زمین کی، جو ساری ملا کر چار جوڑیوں کے لئے کافی تھی، اپنی نگرانی میں مزارعوں سے کاشت کروا رہا تھا۔ اس سال کٹائی کے موقعے پر اس نے گاؤں سے باہر ایک کمرے کا پکا مکان بنوایا اور اس میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ آبائی مکان میں دونوں عورتیں، بچے اور مویشی رہتے تھے اور نعیم کھانا کھانے کے لئے وہاں جایا کرتا تھا۔

اپنے باپ کے آخری الفاظ وہ کبھی نہ بھولا۔ کام، کام، کام۔ یہ اس کی زندگی کا مشغلہ تھا اور کام ہی سے وہ زمینوں اور مکانوں کو گرنے سے بچائے ہوئے تھا۔ علی الصبح سے لے کر دوپہر تک وہ کھیتوں میں رہتا، ہر روز بڑھتی ہوئی فصل [illegible] اسے فکر نہ تھی۔ زیادہ وقت وہ اپنی زمین پر صرف کرتا جو خود کاشت تھی، جس کے بیل اور بیج اس کے اپنے اور مزارع تھے اس کے ملازم تھے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ تمباکو پیتا اور گھنٹہ بھر آرام کرتا۔ پھر اٹھ کر کتابوں میں جنسوں کی خرید و فروخت اور قرض اور ادھار کا اگلا پچھلا حساب دیکھتا۔ اس کے بعد مویشیوں کو دیکھنے کے لئے جاتا اور ایک دن چھوڑ کر باقاعدگی سے گھر میں عورتوں کے پاس جا کر بیٹھتا، قاعدے کی رو سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا، ان کی روزانہ ضروریات اور شکایتیں سنتا، مکان کی مرمت اور مکھن کے ذخیرے کے متعلق پوچھتا اور یہ دیکھ کر خوش ہوتا کہ دونوں عورتیں اب مکمل صلح اور دیانت داری کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ شام کے وقت وہ باقاعدگی سے (کبھی کبھی پوری فوجی وردی میں) پنچایت گھر جاتا جہاں وہ پھر تمباکو پیتا، اور اگر منشی غیر حاضر ہوتا تو پنچایت کی صدارت کرتا اور گاؤں کے روز مرہ کے چوری، اغوا وغیرہ کے مقدمے سنتا۔ اس طرح اب وہ چھوٹے موٹے زمیندار کی طرح رہ رہا تھا اور گاؤں کے باشندوں کی نظر میں اس کی حیثیت مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن اس دلی اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی اور مویشیوں کی ایک بھاری تعداد کے باوجود اس کا مزاج تیز اور تند ہوتا گیا۔ میل جول والے کسانوں کا کہنا تھا کہ یہ خصوصیت اسے اپنے باپ کی طرف سے ورثے میں ملی تھی، لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ اس پر بھی وہ اکثر کسی چھوٹی موٹی بات پر اپنے بھنچے ہاتھ کے ایک طاقتور گھونسے کے ساتھ گاؤں کے کسی کمین یا مزارعے کی ناک سے خون جاری کر دیا کرتا، جس کی ندامت کو

UrduPhoto.com

منانے کے لئے اسے کٹائی کے موقع پر دل کھول کر ہر ایک کو دینا پڑتا۔

اسی عام عزت افزائی کے باوجود وہ ذاتی تعلقات بڑھانے سے ہچکچاتا تھا' اور گاؤں میں مہندر سنگھ کے بعد اب تک کوئی شخص اس کے زیادہ نزدیک نہ ہو سکا تھا۔ کبھی کبھی وہ زمینداری کے معاملات راول کے سپرد کر کے اپنا فوجی تھیلا اٹھا کر چند دن کے لئے ایاز بیگ کے پاس دلی چلا جایا کرتا۔

خزاں کے موسم میں وہ دلی گیا تو ایاز بیگ نے اسے سنہرے حروف میں چھپا ہوا اعلیٰ درجے کے دبیز کاغذ کا ایک کارڈ دیا۔ یہ سہ رنگی کارڈ روشن محل سے جاری کیا گیا تھا اور چند دن میں ہونے والی پرویز کی شادی کا دعوت نامہ تھا۔ اس پر انگریزی زبان میں اس کا نام اور دعوت کی عبارت لکھی تھی۔ اسی طرح کا دوسرا کارڈ ایاز بیگ کے نام کا میز پر پڑا تھا۔ نعیم نے اسے دیکھا اور ہلکے دل سے میز پر رکھ دیا۔ لیکن وہ زیادہ دیر اس سے لاپروائی نہ برت سکا۔ اس نے دوبارہ اٹھایا اور رکھا' اٹھایا اور رکھا' ہاتھ میں الٹ پلٹ کر دیکھا' پھر سلیقے سے تہہ کر کے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ ایاز بیگ نے کھڑکی پر جھک کر سگار پیتے پیتے اس کے تانبے کے رنگ والے چہرے کو زرد اور پھر سرخ ہوتے ہوئے دیکھا۔

"جاؤ گے؟" انھوں نے بظاہر باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں۔" نعیم نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا۔

ایاز [illegible] ہو سکا کہ وہ کس سے مخاطب ہیں' بولے "روشن محل کی دعوت ہے۔ ایسی دعوتیں روز روز کہاں......"

معدے میں بدمزگی محسوس کر کے نعیم نے اگالدان میں تھوکا اور بے چینی سے پھانک کو ملا۔

بالوں کو ناریل کے تیل سے چکنا کرنے کے بعد نعیم نے انھیں ٹھیک طرح بٹھایا اور داڑھی مونڈی۔ رخساروں کو تولیے سے خشک کرتے ہوئے اس نے ذرا مایوسی کے ساتھ دیکھا کہ ٹھوڑی کے نیچے گوشت نمودار ہو رہا تھا اور جبڑوں کے پاس چہرہ فربہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور دیہات کے تیز موسموں نے اس کی جلد کو جو کبھی سفید اور ملائم تھی' کھردرا کر دیا تھا۔ پھر اس نے چرمی تھیلے میں سے پورا فوجی تقریبی لباس نکال کر پہنا' ٹوپی میں مرغابی کا پر لگایا' سینے پر جنگی ملازمت کی رنگین ریشمی فیتیاں اور نیچے چمکتی ہوئی دھات کا کراس لٹکایا' اسی تھیلے میں سے آخری تین فرانسیسی سگار نکال کر اوپر کی جیب میں رکھے اور جانے سے پہلے لکڑی کا ہاتھ احتیاط سے جیب میں ڈال کر آستین سے ڈھک دیا۔

روشن محل میں داخل ہوتے وقت کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں اور سرخ بجری کے راستے دیکھ کر اسے وہ دن یاد آیا جب وہ پہلی دفعہ یہاں آیا تھا۔ آج بھی پہلی دفعہ آ رہا تھا۔ پہلی دفعہ وہ ہمیشہ تقریبات پر ہی آتا تھا' یہ سوچ کر وہ دل میں ہنسا۔

ان سارے برسوں کے دوران روشن محل میں ایک ''گارڈن ہاؤس'' کے علاوہ کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ باغ کے جنوبی کونے میں اونچے اونچے کیلے کے پودوں میں چھپا ہوا بانس اور لکڑی کا یہ گارڈن ہاؤس ایاز بیگ کے نقشے کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ یہ اسے وہاں داخل ہوتے ہی ایاز بیگ نے بتایا۔ گھاس کے قطعوں پر، برآمدوں میں اور باغ کے راستوں پر آج اس پہلی والی تقریب سے کہیں زیادہ چہل پہل تھی۔ دعوت ولیمہ پر مدعو انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو باتوں اور قہقہوں کے شور میں ادھر سے ادھر آ جا رہا تھا۔ بیچ بیچ میں اسے مانوس شکلیں بھی نظر آئیں۔ یہ وہی لڑکے اور لڑکیاں تھے جن کے ساتھ چند برس پیشتر وہ انہی درختوں کے نیچے کھیلا کودا تھا وہ اب جوان ہو چکے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے اپنے جوان ہونے اور ایاز بیگ کے بہت بوڑھے ہو جانے کا خیال آیا۔

''مبارک ہو'' ان دونوں نے پرویز سے ہاتھ ملایا۔

''ہلو......'' پرویز نے گرمجوشی سے نعیم کے ساتھ مصافحہ کیا اور دیر تک اس کا ہاتھ تھامے اس کی آنکھوں میں پرانی دوستی کو تلاش کر کے محبت سے مسکراتا رہا۔ پھر وہ مڑ کر ایاز بیگ سے بولا۔

''معاف کیجئے گا میری بیوی ابھی ادھر گئی ہے۔''

''کوئی بات نہیں...... کوئی بات نہیں۔'' ایاز بیگ نے کہا۔

پھر نعیم نے ہاتھ اٹھا کر خالہ کو سلام کیا۔ ادھیڑ عمر خوبصورت عورت نے پسندیدگی کی نظروں سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

''بہت دن کے بعد آئے ہو نعیم میاں۔'' اس نے کہا۔

نعیم مسکرایا۔ اسی وقت اس نے اپنے آپ کو بہت سے آشنا' ہنستے ہوئے چہروں میں گھرا ہوا پایا۔

''ہلو ہلو'' کا شور اٹھا اور اسے اتنے ہاتھ ملانے پڑے اور ایسے زوردار طریقے پر پرانی دوستی کو تازہ کیا گیا کہ اس کا بازو تھک گیا۔ یہ وہی پرویز اور عذرا کا گروپ تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے نعیم ...... اتنی دیر کے بعد ......'' ایلس گریگسن نے اپنے مخصوص تیز پر مسرت لہجے میں پوچھا۔

''جنگیں فتح کر کے آ رہا ہیں۔ دکھائی نہیں دیتا۔'' ملامت بار نظروں سے ایلس کو دیکھتے ہوئے ارشد نے نعیم کے جسم کی ساری لمبان کی طرف اشارہ کیا۔

معصوم طلعت' جو ویسی کی ویسی چھوٹی سی لڑکی تھی' بولی: ''ارے نعیم' اوہ تم تو ہیرو بن گئے سچ مچ کے۔ سب میں سے ...... اب تمہاری 'ہیرو ورشپ' ہو گی۔'' جوش مسرت سے اس نے آنکھیں میچ لیں اور مٹھیاں کس کر کانوں پر بجانے لگی۔

''ہم نے اخبار میں پڑھا تھا۔'' شیریں نے کہا۔

''کیا؟'' نعیم نے پوچھا۔

UrduPhoto.com

"تمہارے کارنامے کے متعلق اور......" ایک لمحے کے لئے اس کے اردگرد خاموشی چھا گئی اور اس نے پشیمان ہو کر موضوع بدل دیا۔ "تم ہندوستان میں تیسرے آدمی ہو جسے یہ اعزاز دیا گیا ہے۔"

"ہاں۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔ ان کی اس بے ضرورت چشم پوشی پر اسے صدمہ ہوا۔

"ہلو......" عقب سے کسی نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"صاحبزادہ صاحب۔" نعیم نے مڑ کر مصافحہ کیا۔

"ارے میاں کہاں غائب رہے اتنے برس۔ بڑے میدان مار کے آ رہے ہو واللہ کیا شاندار سپاہی ہو اہا ہاہا......" وحید نے پسندیدگی سے اسے دیکھا۔ "اب تو بڑے مشہور و معروف آدمی......"

"نعیم تم ان سے ملے......" شیریں نے بات کاٹ کر کہا۔ "بیگم بلقیس وحید الدین آف......"

"ہاں میری بیوی سے ملو نعیم۔"

"آپ انہیں جانتی ہیں بلقیس بھابی۔" [illegible] انداز میں کہا۔ "آپ انہیں نہیں جانتیں؟ ارے واہ۔ بھئی نعیم' یعنی نعیم [illegible] خان۔ ہمارے بہت پرانے دوست ہیں۔"

بلقیس [illegible] انجانے پن سے سر کو خوبصورت جنبش دی۔ وہ ایک پتلی سی زردرو جاگیردارانہ نقوش والی لڑکی تھی۔ نعیم نے ذرا سا جھک کر احتیاط سے اسے سلام کیا۔ وہ معمولی اخلاق برتنے کی کوشش [illegible] رہا تھا۔ اس میں ایک قدرتی رعونت [illegible] ساتھی اس کی شخصیت میں اس تبدیلی کو اشتیاق سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے گھیرے اس کے چست' بے داغ فوجی لباس اور چمکتے ہوئے کراس اور ٹوپی کے [illegible] کو تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ درمیان میں وہ اپنے آپ کو سنبھالے' سب میں سے سر نکالے کھڑا سنجیدگی اور احتیاط سے ہنستا رہا' اس شخص کی طرح جو بیک وقت مغرور' رنجیدہ اور مسرور ہو۔

جب مہمان زیادہ اکٹھے ہونے لگے تو وہ اسے کمروں کی طرف لے گئے اور چند ایک ادھر ادھر بکھر گئے۔ اندر اس کا اتنے لوگوں سے تعارف کرایا گیا کہ اسے سگار پھینکنے کے لئے باہر آنا پڑا۔ موٹے موٹے بیوپاریوں اور جاگیرداروں اور سیاسی لیڈروں نے اسے بے اعتنائی سے دیکھا اور فانوسوں کی روشنی میں صوفوں میں دھنس کر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

نوجوان عہدیدار' جو پرویز اور وحید کے دوست تھے' اسی خوش دلی کے ساتھ اس سے ملے جو ان لوگوں کا خاصہ تھا۔ انگریز عورتوں اور مردوں نے اس کے سینے پر لٹکتے ہوئے کراس کی عزت میں اپنی جگہ کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور اپنے نزدیک بیٹھنے کے لئے کہا۔ اس نے کئی جگہ رکنا چاہا لیکن ارشد' شیریں اور غیاث اس کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ ان خوشدل لوگوں کے لئے نعیم ایک دوسری دنیا کا بے حد دلچسپ باشندہ تھا جو طبقاتی اختلاف کے باوجود مغرور اور باوقار تھا اور کسی طرح سے ان کے دوستوں کے حلقے میں شامل ہو چکا تھا اور اس وقت فوجی لباس

میں بے حد دلکش لگ رہا تھا۔

آخر اس گہما گہمی سے تنگ آ کر وہ ایک جگہ پر بیٹھ گیا۔ یہ ایک ادھیڑ عمر زمیندار تھا جس نے اپنے پاس اسے جگہ دی۔ اس نے دیہاتی رئیسوں کا لباس پہن رکھا تھا۔

''اہا...... نوجوان' تم فوج میں ملازمت کر چکے ہو؟ فوج واقعی تم جیسے نوجوانوں سے بنتی ہے' جو ملک فتح کرتی ہے۔ جوانی میں میں بھی فوج میں بھرتی ہونا چاہتا تھا لیکن میرا وزن کم تھا۔ شاید میں زمینداری کے لیے ہی موزوں تھا۔ اہاہا......'' اس نے نعیم کو چھاتی پر چھوا۔ ''کیسا عالی شان تمغہ ہے۔ میں نے دور سے دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ تم نے اصل جنگیں لڑی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے بھئی کہ ہی ہی...... میں سادہ سا آدمی ہوں لیکن جب تم اندر داخل ہوئے تو میرا دل چاہا کہ تم میرے پاس آ کر بیٹھو۔ تم نے برا تو نہیں مانا۔''

''اوہ ہرگز نہیں۔''

''دراصل میں فوج کا [illegible] ہی شیدا ہوں لیکن اررر...... میں شاید زمینداری کے لیے ہی موزوں تھا۔ زمینداری کے لیے ہی موزوں تھا۔ تم کہاں سے آ رہے ہو؟''

''روشن پور سے۔''

''[illegible] تو تم مہمانوں میں شامل ہو۔ ہی ہی'' وہ کم پڑھے لکھے خوش باش دیہاتی رئیسوں کی طرح ہنسا اور نعیم کو کندھے پر تھپکا۔ ''روشن آغا سے میری [illegible] بس...... مگر کیا وضعداری ہے حضرت جب' غازی آباد سے مجھے بلا بھیجا۔''

''آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟'' نعیم نے پوچھا۔

''وہ مختصر سی زمینداری ہے بھائی۔ غازی آباد میں۔ لیکن میرے باغوں میں اول درجہ کا گلاب ہوتا ہے۔ جنگ میں تم نے پھول کہاں دیکھے ہوں گے۔ میرا گاؤں پھولوں کا گاؤں ہے' گلاب کے پھولوں کا گاؤں۔ تم وہاں ضرور آنا۔''

''یہ بات تو نہیں۔ غیر ملکوں میں میں نے بہت اچھے اچھے پھول دیکھے ہیں۔''

''ابھی تو میں بیاہی کی تیاری کر رہا تھا جب روشن آغا کا سندیش ملا......''

''آپ کون سی گندم بوتے ہیں؟'' نعیم نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''سفید۔ روشن پور میں سرخ گندم ہوتی ہے' میں جانتا ہوں' جو ایکڑ میں بمشکل بیس من اترتی ہے۔ میری سفید گندم۔''

وہ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں نعیم اس کے باتونی پن سے اکتا کر اور غازی آباد آنے کا وعدہ کر کے اٹھا اور برآمدے میں نکل آیا۔ سگار جلا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پرویز ارشد وغیرہ غائب ہو چکے تھے اور ادھیڑ عمر کے باوقار' اجنبی انسان اس کے ارد گرد چل پھر رہے تھے۔ اگلے برآمدے میں اس کی مڈبھیڑ

UrduPhoto.com

روشن آغا سے ہو گئی۔

"ارے نعیم۔" وہ مسرت اور تعجب سے بولے۔ نعیم نے جھک کر سلام کیا۔

"تم یہاں کیوں نہیں آتے؟" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے بولے۔ "نیاز بیگ کی موت کا ہمیں بہت رنج ہوا۔ ہمارا پیغام مل گیا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"ہم لوگ ایک ہی نسل کے آدمی تھے۔ نیاز بیگ اور ایاز بیگ اور ہم سب۔ اب تم لوگوں کو چاہیے کہ ہم سے ملا کرو۔ نئی نسل کچھ اس قدر بے مروت واقع ہوئی ہے۔" وہ اداسی سے ہنسے اور گزر گئے۔

کمروں میں سے ابھی تک کئی نظریں اس پر مرکوز تھیں۔ خصوصاً خواتین اس فوجی لباس اور سیدھے جسم والے شخص کو دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے کی پیدائشی خوبصورتی کے ساتھ نقوش کی خالص مردانہ کرختگی اور بھاری پن نے مل کر اس میں بلا کی کشش پیدا کر دی تھی اور جو سر اٹھائے ایک ہاتھ جیب میں ڈالے برآمدوں میں گھومتا پھر رہا تھا۔

پھر کھانا شروع ہونے کی خبر نامعلوم طریق پر چاروں طرف پھیل گئی اور مہمانوں کا ہجوم باہر کی طرف جہاں کھانے کی میزیں لگی تھیں، نکلنے لگا۔ ہال کے ایک بڑے گملے پر پیر رکھے سگار پیتے ہوئے اس نے اپنی قطعی بے وجہ زود رنجی کو محسوس [illegible]

برآمدے کے آخر پر اوپر کی منزل کو جاتے ہوئے لکڑی کے زینے پر سے اترتی ہوئی عذرا کا سامنا خالہ سے ہوا۔

"بی بی آپ کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ سارے مہمان تو آ چکے۔" خالہ نے کہا۔

عذرا لکڑی کے جنگلے پر ہاتھ رکھے بے دھیانی سے کھڑی رہی۔ نیچے برآمدے میں نعیم ان کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

"خالہ آپ اس سے ملیں؟"

"نعیم۔ ہاں۔ وہ اسی طرح دلکش اور خلیق ہے۔" خالہ نے تھم کر بات شروع کی۔ "لیکن...... لیکن، اوہ، میں بیان نہیں کر سکتی۔ جیسے دسمبر میں پتھر کی دیوار۔ اس کا ایک بازو ضائع ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہری ہے۔ موت!" وہ کپکپا کر زینہ چڑھنے لگیں۔

نعیم باہر جانے کے لیے مڑا۔ اسی وقت عذرا جیسے ہوا پر چلتی ہوئی اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ چند سیکنڈ تک دونوں ششدر کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ اس نے ہندوستانی شادیوں کا زرتار لباس پہن رکھا تھا اور بے حد زرد نظر آ رہی تھی۔

پھر نعیم نے سنبھل کر سگار کی راکھ جھٹکی اور اسی سرد لاتعلق لہجے میں بولا: "عذرا بیگم، کیسی طبیعت ہے؟ میں

کھانے پر جا رہا تھا۔"

"اچھا...... چلیے۔" عذرا نے اس کی نظروں سے بچنے کے لئے دور ہجوم کے ایک حصے پر دیکھتے ہوئے بے خیالی سے کہا۔ لیکن کوشش کے باوجود اس کے قدم نہ اٹھ سکے۔ نعیم بد اخلاقی سے گملے پر پیر رکھے کھڑا رہا۔ باہر کھانا کھاتے ہوئے لاتعداد مہمانوں کا شور آہستہ آہستہ اٹھ رہا تھا اور وہ دونوں وہاں خاموش کھڑے اس ملاقات کے بے ڈھنگے پن کو اور ایک دوسرے کے وجود کو شدت اور بے چینی کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ غیر محسوس طریقے پر نعیم نے فیصلہ کیا کہ اب بات کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

آخر عذرا نے اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑا۔ "بہت دنوں کے بعد تم...... آپ سے ملاقات ہوئی۔"

"میں کام میں لگا رہا۔" نعیم نے ایک مصروف آدمی کے مختصر لہجے میں کہا اور عذرا کے وجود کی نفی کرنے کو سگار کا دھواں اس کے منہ پر چھوڑا۔

لیکن ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس شدت اختیار کر گیا اور وہ ایک بار پھر برتنوں کے ٹکرانے اور انسانی آوازوں کے ملے جلے شور کے پیچھے خاموش ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ برآمدے کے بیرونی شور اور اندرونی سناٹے کو انہوں نے ایک ساتھ محسوس کیا۔ بے چین لمحے ایک ایک کر کے ان کے سروں پر ٹپکتے رہے۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ حتیٰ کہ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی ملاقات اور یہ گفتگو انتہائی مضحکہ خیز اور بے مصرف [illegible]

"آپ [illegible]" عذرا نے [illegible] کہنا چاہا [illegible]

اچانک نعیم کا زخمی احساس انتہا پر پہنچ گیا۔ تیز تیز سانسوں کے ساتھ اس کی چھاتی اٹھنے اور بیٹھنے لگی اور وہ رک رک کر بولا: "ہاں۔ مجھے حکومت کی ملازمت مل گئی تھی۔ باوجود تمہارے۔ تمہارے باوجود......"

ایک جھٹکے سے عذرا نے اس کی طرف دیکھا۔ شدید رنج سے اس کے ہونٹ اور گال کانپ اٹھے۔

"نعیم...... تم...... تم مغرور ہو۔" اس نے کہا۔ دفعتاً آنسوؤں کا ایک ریلا اس کی آنکھوں میں اور حلق میں عود کر آیا۔

اور اس وقت 'دونوں نے' اپنی اپنی جگہ پر 'ایک ہی وقت میں' دیکھا' اور محسوس کیا' کہ محبت کا جذبہ فاصلے' اختلاف اور چوبی بازوؤں کے باوجود طاقت ور ہے۔

وہ مڑی اور دوڑتی ہوئی خالی کمرے میں داخل ہوئی۔

"عذرا...... عذرا۔" نعیم اس کے پیچھے لپکا۔ کمرے سے گزرتے ہوئے ایک ملازم نے عذرا کو روتے ہوئے دیکھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

چمڑے کی ایک بڑی سی مطالعے کی کرسی میں پوری طرح سما کر بیٹھی ہوئی عذرا نے ہونٹ سختی سے اندر کی طرف داب رکھے تھے اور چھوٹی سی لڑکی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ جذبات کے ہنگام سے اس کا چہرہ زرد اور خوف زدہ تھا۔ نعیم فرش پر ایک گھٹنا ٹیک کر بیٹھا اس کے ہاتھ کو ہاتھ میں لئے گھور رہا تھا۔

"نعیم ۔" دیر کے بعد عذرا نے ہونٹ ڈھیلے چھوڑ کر صاف اور کمزور آواز میں کہا۔ "عورتیں بے شرم نہیں ہوتیں، پر محبت ضرور کرتی ہیں۔"

"مجھے معاف کردو، معاف کردو۔" وہ اس کے ہاتھ میں منہ چھپا کر کہتا رہا۔

اور پھر وہ ہوا جو روشن پور والوں کی تاریخ میں آج تک نہ ہوا تھا اور حقیقتاً جو ہندوستان کے جاگیردار اور امراء کے طبقے میں بہت کم ہوا تھا۔

روشن محل پر موت کا سکوت طاری تھا اور موسم خزاں کی وہ شام اونچی چھتوں والی اس مہیب عمارت پر آہستہ آہستہ جھکتی آ رہی تھی۔ برآمدوں میں اور بند دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں پر روشنیاں جل رہی تھیں، لیکن کوئی متنفس دکھائی نہ دے رہا تھا۔ گھر کے تمام نوکر گھر کے پچھواڑے اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے تھے اور برآمدوں میں قدم دھرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والوں کو پہلی نظر میں سنسان برآمدے اور روشوں پر اکٹھے کیے ہوئے خشک پتوں کے ڈھیر دیکھ کر اس جگہ کی ہمہ گیر ویرانی کا احساس ہوتا تھا۔

اوپر کی منزل میں سرخ شیشوں والے بڑے دریچے پر یوکلپٹس کے پتے سایہ کیے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے عذرا کے کمرے میں خالہ پلنگ کے کونے پر بیٹھی تھی۔ پلنگ پر عذرا گھٹنوں اور کہنیوں کے بل اوندھی لیٹی تھی۔ کمرے کی فضا [illegible]۔

"آہ......" خالہ نے ہاتھ اٹھا کر ہوا میں پھیلائے اور پھر گود میں رکھ لیے۔ "کس قدر شرمناک...... آج تک ایسا نہیں ہوا۔ کبھی نہیں، تم سوچ نہیں سکتیں؟" کچھ دیر تک وہ عذرا کی بے حرکت پشت کو دیکھتی رہیں، پھر سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر آہستہ آہستہ دبانے لگیں۔

عذرا اٹھ کر آتش دان تک گئی اور کمرے کی طرف پشت کیے دیر تک کھڑی رہی۔ "کیا نہیں ہوا؟" اس نے بظاہر کارنس پر دھرے دھات کے مجسمے سے پوچھا۔

"کہ روشن پور والوں کی لڑکیاں نچلے طبقے میں شادی کریں۔" خالہ نے سر چھوڑ کر کہا۔

عذرا کلدار گڑیا کی طرح مڑی۔ بجلی کی روشنی میں اس کے دبلے، چوبی چہرے میں سے پیلاہٹ پھوٹ رہی تھی اور اس کی آنکھیں خشک اور پھیلی ہوئی تھیں۔

"نچلا طبقہ، نچلا طبقہ، کیا ہے!" اس نے ایک ساتھ تختی اور بے چارگی سے کہا۔ "کیا وہ کمین ہے؟ کیا وہ ہماری زمین کاشت کرتا ہے؟ اس کے پاس اپنے مویشی نہیں ہیں اور گھوڑے اور مکان......"

"ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں۔ ان کے باوجود وہ بے حیثیت ہے۔ اس کا باپ ایک معمولی کسان تھا۔" خالہ نے اس عورت کے پُرعزم اور جسارت آمیز لہجے میں بات کی جو خود باحیثیت طبقے میں چور دروازے سے داخل ہوئی ہو اور اپنی زندگی سے بیک وقت خوف زدہ اور مطمئن ہو۔ "اور اس کے پاس تمہارے لئے کچھ نہیں

ہے۔ تم نادان ہو۔ اسے ایک کسان عورت کی ضرورت ہے۔''

''وہ کسان نہیں ہے۔'' عذرا نے اسی عزم اور بیچارگی سے کہا۔ ''وہ پڑھا لکھا ہے۔ وہ یہاں پر بھی رہ سکتا ہے۔ اور۔'' اس نے وجاہت کے مجسمے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اس کی بے جان آنکھوں میں دیکھ کر بولی:

''کیا وہ بہادر نہیں ہے؟''

''اوہ......'' خالہ دکھ سے ہنسی۔ ''ہاں۔ وہ بہادر ہے' اور مغرور اور پُرکشش بھی...... لیکن وہ ناکارہ ہو چکا ہے۔ وہ......''

عذرا نے دہل کر اسے دیکھا' اور پہلی بار اس کی آنکھوں میں خالہ کے لئے خوف اور نفرت کا جذبہ پیدا ہوا۔ بوڑھی عورت نے اسے دیکھا اور اپنی بات ختم کرنے کا عزم کھو دیا۔ کمزور آواز میں وہ بولی:

''اور روشن آغا۔ تم انہیں صدمہ پہنچاؤ گی؟''

عذرا جس نے چند لمحے پہلے [illegible] آپ کو رونے سے روکا تھا یکلخت پریشان ہوگئی۔ اس نے [illegible] کر دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھا اور بھاگتی ہوئی آ کر پلنگ پر گر پڑی۔

''بابا...... نہیں' نہیں' بابا...... وہ مجھے نہیں روکیں گے نہیں۔''

[illegible] بابا [illegible] سے [illegible] دیا۔

خالہ دل میں رحم اور محبت اور مستقبل کا خوف لئے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے عذرا کی پشت پر ہاتھ رکھا۔ ''اٹھو بی بی' کھانا کھاؤ۔''

''نہیں...... نہیں'' عذرا نے دہرایا۔ ''بابا سے کہہ دو میں انہیں صدمہ پہنچاؤں گی۔ لیکن...... نہیں۔''

ساتھ والے کمرے میں روشن آغا دیواروں کے ساتھ ساتھ چکر لگاتے ہوئے تھک کر بیٹھ گئے۔ بازو سینے پر باندھ کر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں اور سر صوفے کی پشت پر ٹیک دیا۔ ان کا چہرہ بہت بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ پرویز کونے کے سٹول پر سے اٹھا اور اپنا سیاہ ہیٹ اٹھا کر چپکے سے باہر نکل گیا۔ باغ کی طرف کھلنے والے دریچے کے آگے صوفے پر اس کی ماں اور بیوی اور رشتے کی بہن شیریں خاموش بیٹھی دہشت سے روشن آغا کو دیکھتی رہیں۔

دروازے کے رستے عذرا کے ہولے ہولے سسکنے کی آواز آ رہی تھی' اور باہر باغ کے نیم تاریک' سنسان راستوں پر خزاں کی ہوا میں خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔

اس کے بعد اس سلسلے میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر اس کہانی کے احاطے سے باہر ہے۔ مختصر یہ کہ جاڑوں میں نعیم اور عذرا کی شادی ہوگئی۔ پھر بھی یہ بتانا ضروری ہے کہ اس شادی کو روکنے کے لئے جو دیوانہ وار کوششیں ہوئیں اور صوبے بھر کے تعلقداروں کی جانب سے اس انتہائی مضحکہ خیز خیال کی جو مخالفت ہوئی وہ امراء کے اس

طبقے کی اپنی انفرادیت اور علیحدگی برقرار رکھنے کی خواہش کی خصوصیت سے مظہر تھی۔ شادی بہر حال عذرا کی قوت ارادی کی بدولت، جس نے کہ اس سے پہلے کہ روشن آغا اس تکلیف دہ سکیم سے تعاون کرنے پر اپنے آپ کو مجبور کرتے گھر کے دوسرے افراد کو اپنی بے پناہ بیچارگی اور عزم سے متاثر کر دیا تھا، انجام پائی۔

گاؤں کے باغ میں روشن آغا نے انہیں شاندار مکان بنا کر دیا جس میں دونوں نے رہائش اختیار کر لی۔ مگر کچھ عرصے کے بعد عذرا کثرت سے ساتھ طویل وقفوں کے لیے دلی جا کر رہنے لگی جہاں کی اونچی، چمکدار زندگی میں گاؤں کی پُرسکون اور غیر دلچسپ فضا کے مقابلے میں اس کے لیے زیادہ کشش تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں نعیم زیادہ تر وقت روشن آغا کی زمینداری کے معاملات پر صرف کرتا جس کا تمام تر بندوبست اب براہ راست اس کی زیر نگرانی ہو رہا تھا۔

(۱۸)

وہ ایک ایسی صبح تھی جب بہار کا زور ٹوٹ چکا ہوتا ہے اور دھوپ میں تیزی آ جاتی ہے۔ جب پتوں کا رنگ شوخ سبز سے گہرا سبز ہو جاتا ہے اور ڈالیوں پر موسم بہار کے آخری پھول کھلتے ہیں اور آسمان پھیلا اور گرم ہونا شروع ہوتا ہے [illegible] نکل آتی ہیں اور مرد دن بھر درانتیوں کے دندانے بناتے اور بیلوں کے کھر صاف کرتے رہتے ہیں اور ان کی آنکھوں میں کٹائی سے پہلے کا خوف سایہ کئے رہتا ہے اور ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوتی ہے۔ جب دور دور تک سونے کے رنگ کی تیار فصل گرد کے طوفانوں میں لہراتی ہے اور چنبیلی کے پودوں پر گرما کی پہلی کلیاں نمودار ہوتی ہیں۔

سورج نعیم کے مکان کی دیواروں سے اوپر آ چکا تھا اور دھوپ صحن میں پھیلتی جا رہی تھی۔ عذرا پچھلی شام کو دلی سے لوٹی تھی اور رات بھر وہ خوب لپٹ کر سوئے رہے تھے۔ چنانچہ صبح وہ خوش و خرم اٹھے تھے۔ نعمت خانے کے فرش پر بیٹھ کر زور زور سے ہنستے اور باتیں کرتے ہوئے انہوں نے سرخ سنگتروں اور بھنے ہوئے جَو کے دلیے اور دودھ کا ناشتہ کیا۔ پھر انہوں نے چائے پی اور مویشیوں کے احاطے میں نکل آئے۔ بھوری بھینس کی گردن کا زخم ملاحظہ کر دیکھا اور اپنے سامنے جانوروں کے رکھوالے سے اس پر ہلدی اور سرسوں کے تیل کی پٹی کرائی۔ پھر وہ دوسرے جانوروں کے پاس سے گزرے اور نعیم نے جو گزری ہوئی رات کی جسمانی آسودگی کے زیر اثر ملنسار موڈ میں تھا، ہر ایک جانور سے الگ الگ اس کا حال پوچھا۔ دھوپ میں جگالی کرتی ہوئی سیاہ اور سفید گایوں، بھینسوں، بھیڑوں اور دوسرے مویشیوں نے اس کا جواب اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ اس قانع اور لاتعلق انداز میں دیکھ کر دیا جس کے ذریعے مویشی اپنی آسودگی اور گہری محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ صرف دونوں گھوڑے خوشی سے ہنہنائے اور دموں کو پھندنے کی طرح ہوا میں لہرایا جس پر نعیم نے اپنے باپ کی بات دہرائی کہ گھوڑے کسان کے عقلمند اور نزدیک

UrduPhoto.com

ترین رشتہ داروں میں سے ہوتے ہیں۔

مویشیوں سے ملاقات کرنے کے بعد انہوں نے رکھوالی کے کتوں کو صبح کا کھانا کھاتے ہوئے دیکھا اور دوپہر کے راتب کے متعلق نوکر کو ہدایات دیں۔ پھر وہ گوالے کی کوٹھری میں گئے اور صبح کے دودھ کی مقدار دیکھی۔ وہیں پر انہوں نے کل شام کی اتری ہوئی بھیڑوں کی اون کا معائنہ کیا۔ پھر وہاں سے وہ گھر کے پچھواڑے سبزی کی کیاریوں میں گئے اور شیشے کی طرح چمکدار پانی کو شرانے سے نالی میں بہتے اور آگے جا کر خاموشی سے مختلف راستوں میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ نئی کیاریوں میں پانی انجانی خاموشی کے ساتھ اپنے رستے میں آنے والے ہر بھورے اور خشک مٹی کے ڈھیلے کو سیاہ کرتا ہوا گہرائیوں میں اتر رہا تھا جہاں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے بیجوں کے ہزاروں ننھے ننھے سوراخوں میں رچ بس کر انہیں نرم اور گداز بناتا ہوا نازک ریشمیں کونپلوں کی تخلیق کر رہا تھا جو پانی کے اترنے ہی کے ساتھ خاموش اور چور انداز میں بڑھتی اور زمین پھاڑ کر باہر نکلتی آ رہی تھیں۔ عذرا کے کندھے پر ہاتھ رکھے [illegible] دیکھ کر اور محسوس کر کے نعیم کی آنکھیں تخلیق کے سرور سے مند گئیں اور اس نے سوچا کہ وہ بنیادی طور پر کسان ہے اور کسان کا بیٹا ہے اور عذرا کی اونچے چھتوں والی دنیا میں وہ چور دروازے سے داخل ہوا ہے۔ لیکن اس خیال نے جس نے کہ آگے جا کر زندگی میں کئی بار اسے لاچار کر دیا، اس وقت اس کو محظوظ کیا اور آ[illegible]ے مسکرا کر اس نے عذرا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ساتھ لگا لیا۔

"باپ [illegible] ہی باپ کا باپ ہے اور [illegible]"

عذرا نے آنکھوں میں محبت کی ساری مستی بھر کر اسے دیکھا اور ایک انجانے خیال سے مسکرائی۔

وہاں سے وہ [illegible] کی بڑھتی ہوئی باڑ کے ساتھ ساتھ لمبا چکر کاٹ کر باغ میں نکل آئے اور بل کھاتے ہوئے تنگ راستوں میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے کھلتے اور مرجھاتے ہوئے پھولوں اور پودوں کا معائنہ کیا۔ کھٹے اور لیموں کی شاخوں کی چھانٹی اور چنبیلی کی قطار کے نیچے گوڈی کرنے کا حکم دے کر وہ واپس ہوئے۔ واپسی پر انہوں نے صبح کے دو گلدستے بنائے اور اس وقت انہیں گزرتی ہوئی بہار کا احساس ہوا اور انہوں نے ایک دوسرے سے ان وقتوں کا ذکر کیا جب پانچ پانچ گلدستے بنانے پر بھی پودے اسی طرح لدے پھندے رہتے تھے۔ نعیم نے گرے ہوئے بے شمار خشک پتوں اور پھولوں کو زمین میں دبا دینے اور اس طرح عمدہ کھاد تیار کرنے کی تجویز پیش کی جسے عذرا نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ وہاں نمی اور سائے میں پڑے پڑے وہ خود بخود گل سڑ جائیں گے اور گوڈی پر زمین میں رل مل جائیں گے۔ نعیم اپنی بیوی کی اس احتقانہ دلیل پر دل میں ہنسا۔

پھر وہ اپنے مخصوص پیپل کے درخت کے نیچے پہنچے اور ڈالیوں میں سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ میں نار کے موڑھوں پر بیٹھ گئے۔ عذرا اون کے گولے سنبھال کر اس کے موزے بننے لگی اور نعیم نے موڑھے پر کھسک کر ٹانگیں پھیلا دیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ صبح کا پہلا سگریٹ سلگاتا کچھ یاد آنے پر اٹھا اور اندر سے جا کر لکڑی کی ایک تختی اٹھا لایا۔ کئی روز سے یہ زیر بحث تھا کہ اس پر کیا لکھ کر پھاٹک پر لگایا جائے۔ ہر روز کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکنے

کے باعث اسے ملتوی کر دینا پڑتا۔ آج اس نے یہ کام ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے تختی مونڈھوں کے درمیان لا کر رکھی تو عذرا نے مسکرا کر سلائیاں ایک طرف رکھیں اور جھک کر بیٹھ گئی۔ بڑی دیر تک وہ دونوں پچھلے دنوں کی تجویزوں پر غور کرتے رہے۔ نعیم اور عذرا۔ روشن محل۔ ے فلاور (ایک بہت بھولا ہوا نام نعیم نے پیش کیا)۔ اور اسی طرح کے کئی اور نام۔ لیکن اس سارے مباحثے کا کوئی مطلب نہ نکلا اور جب ہر ایک نام اور ہر ایک سطر کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر کسی نہ کسی طرف سے مسترد کر دی گئی تو انہوں نے ہار کر اس کا فیصلہ مویشیوں کے رکھوالے پر چھوڑ دیا جو کسی کام سے اُدھر سے گزر رہا تھا۔ بوڑھے رکھوالے نے ان کے اصرار کرنے پر، کسانوں کے انداز میں شرماتے ہوئے ایک سادہ سی سطر پیش کی جو دفعتاً ان دونوں کو بے حد بھا گئی اور وہ اس پر متفق ہو گئے۔ اسی وقت نعیم نے سیاہ روغن کے ساتھ تختی پر لکھا۔ "یہاں نعیم اور اس کی بیوی رہتے ہیں۔" اور سوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دیا۔ پھر اس نے سگریٹ سلگایا اور مسرت اور سکون کے ساتھ صبح کی دھوپ کو ٹانگوں پر پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔

موزے بنتے ہوئے عذرا بار بار اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کوئی بات کرنا چاہ رہی تھی۔ نعیم اونگھ رہا تھا۔ اس کا بھاری جسم مونڈھے پر پھیلا اور سر چھاتی پر جھکا ہوا تھا۔ دھوپ اس کی ٹھوڑی تک پہنچ چکی تھی اور ایک کان اور ایک گال تپش سے لال ہو رہے تھے۔ اوپر کے ہونٹ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کا سگریٹ چپل کے ایک ادھ ہوئے پر گرا تھا اور سگریٹ اور پتا دونوں راکھ ہو چکے تھے اور ان پر مکڑی کا ایک باریک تار چمک رہا تھا۔ مونڈھے کے [illegible] اس کے مونڈھے پر آ بیٹھی، لیکن اس کی غنودگی میں جو دھوپ کی آرام دہ حرارت، تازہ ہوا، قوت بخش کھانے اور جسمانی آسودگی کا نتیجہ تھی، چڑیا کی مداخلت سے کوئی فرق نہ آیا۔ قریب سے بہتی ہوئی نالی میں سطحِ آب پر دھوپ کی چنگاریاں جل رہی تھیں۔

آخر اس کی گہری نیند سے بے چین ہو کر عذرا نے اون کے گولے اور سلائیاں مونڈھے پر رکھیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ جھڑے ہوئے پتوں پر اس کے چلنے کی آواز سے نعیم کی آنکھ کھل گئی۔

"اوہ میں سو گیا تھا؟" وہ ہنسا۔

"دھوپ آ گئی تھی۔" عذرا نے سرسری طور پر کہا پھر وہ بے چینی سے مڑ کر باغ میں داخل ہو گئی۔

دیر تک وہ خنک، سایہ دار راستوں پر گھومتے رہے۔ دھوپ میں سے اٹھنے کے بعد درختوں کا سایہ انہیں آرام دہ اور بھلا محسوس ہوا۔ دوپہر سے پہلے کا آسمان روشن اور چمکدار تھا اور فضا بے حد خاموش اور شانت۔ راستوں کے ساتھ ساتھ پانی کی نالیاں اپنے مخصوص دھیمے شور کے ساتھ بہہ رہی تھیں اور درختوں کی چوٹیوں پر اڑتی ہوئی سبز چڑیوں کے پر دھوپ میں چمک رہے تھے۔

ہریالی اور سکون کے اس لمحے میں اگر کسی جان دار کے دل میں بے چینی تھی تو وہ عذرا تھی۔ لکڑی کے پھاٹک پر جھک کر وہ بولی: "جلیانوالہ باغ کا واقعہ سنا؟"

"ہاں۔" نعیم نے کہا۔ "مگر مجھے تفصیلات معلوم نہیں ہوئیں۔ بہت آدمی مرے؟"

UrduPhoto.com

''ایک ہزار کے قریب موتیں بتلاتے ہیں۔ ابھی تو مارشل لاء لگا ہے۔ مکمل بلیک آؤٹ۔ پنجاب میں ہر طرف سے داخلہ بند ہے۔''

وہ لکڑی کے جنگلے پر جھکی رہی۔ نعیم سامنے فصلوں میں سے گزرتی ہوئی ایک جوان کسان عورت کو دیکھ رہا تھا۔ عورت نے سر پر مٹی کا دودھ اور روٹیوں کی چنگیر اٹھا رکھی تھی اور پکی ہوئی فصل میں سے گزرتے ہوئے اس کا سر اور کندھے نظر آ رہے تھے۔ ایک کوا بڑی آہستگی سے چنگیر میں آ کر بیٹھا اور روٹیوں پر چونچ مارنے لگا۔ نعیم مسکرا کر اس وقت تک کوے اور عورت کو دیکھتا رہا جب تک کہ وہ نظر سے غائب نہ ہو گئے۔

''شاید خلافت کے سلسلے میں ہوا۔'' پھر اس نے کہا۔

''خلافت اور رولٹ ایکٹ۔''

''اررر..... رولٹ ایکٹ؟''

''ہاں۔ تم نے تو اب اخبار پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ تمہیں رولٹ ایکٹ..... کا بھی پتا نہیں۔'' عذرا نے جھلا کر بات ختم کر دی۔

نعیم [illegible] کو چھو کر شرمندگی سے ہنسا۔ ''رولٹ ایکٹ اور اصل میں مصروف۔''

''مصروفیت کی بات نہیں۔ تم یوں ہی لاتعلق ہوتے جا رہے ہو۔'' عذرا نے تیزی [illegible] اور چل پڑی۔

دونوں [illegible] پیچھے [illegible] نعیم نے سگریٹ سلگایا۔ لیکن جلد ہی عذرا سلائیوں پر الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگی اور اس کی ذہنی کشمکش اوپر آ گئی۔ اس نے جلد جلد کئی بار نعیم کی طرف دیکھا۔ آخر دونوں ہاتھ گود میں رکھ دیے۔

''تم جنگ پر سے لوٹ کر دو سال تک کیا کرتے رہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں؟ کانگرس کی طرف سے کام کرتا رہا۔''

وہ پھر سلائیوں پر جھک گئی۔

''کیوں؟'' نعیم نے پوچھا۔

''مجھے علم ہے۔''

''پھر؟''

''اب کیوں نہیں جاتے؟''

نعیم نے تعجب سے اسے دیکھا۔ غنودگی جو ابھی تک اس پر چھائی ہوئی تھی دفعتاً غائب ہو گئی۔ ''بیگی ہو! تمہیں چھوڑ کر میں کہاں جاؤں!''

عذرا نے سر اٹھا کر اپنی بھوری، مضطرب آنکھوں سے نعیم کو دیکھا۔ ''کیوں کیا ہندوستان آزاد ہو گیا؟''

نعیم کے دل میں ایک بہت پرانے خوف نے سر اٹھایا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ امن اور سکھ کی اس گھڑی میں

UrduPhoto.com

ایک فردِ واحد کے اضطراب اور بے چینی نے متعدی بیماری کی طرح ہر شے کو گرفت میں لے لیا تھا۔ نعیم نے ہتھیلی کے تنے پر ہاتھ رکھ کر نالی میں تھوکا۔ اس کے سینے میں ایک بھاری' بے نام سی خلش ابھر رہی تھی۔

عذرا اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ ’’نعیم ......‘‘ اس نے آنکھیں اٹھا کر کہا اور نعیم نے دیکھا کہ ان میں اس عورت کی' ہزار عورتوں کی بھرپور قوتیں یکجا تھیں۔ انتہائی کوشش سے وہ ذرا سا مسکرایا۔

’’چلو چلیں ......‘‘ عذرا بولی۔

’’کہاں؟‘‘

’’امرتسر ...... دونوں! ہیں' نعیم؟‘‘

’’عذرا ...... یہ زندگی آسان نہیں ہے۔ تم نہیں جانتیں۔‘‘

’’لیکن اتنی دلچسپ ہے۔ اس بار میں دلی گئی تو ویلاسی سٹرز نے مدینتی مال کی دکانوں پر پکٹنگ کی تھی۔ ان کی تصویریں سارے بڑے بڑے اخباروں اور رسالوں میں چھپیں اور جہاں بھی میں گئی انہیں کا تذکرہ رہا۔ ہر موقع پر ہر پارٹی میں تم کانگرس پارٹی کے ممبر ہو۔ ہم آسانی سے جا سکتے ہیں۔ نہیں نعیم؟ ہم دونوں۔ ہیں' نعیم؟‘‘ اس نے لجاجت سے دونوں ہاتھ اس کے بازو پر رکھے۔ ’’میں اس جگہ سے اکتا گئی ہوں۔‘‘

نعیم نے اس کے کندھوں کے گرد بازو لپیٹ کر اپنی طرف کھینچا اور مسکرا کر بولا۔ ’’اچھا‘‘

را[illegible] رہا اور اس کے اوپر اسی خاموشی سے انسانی خواہشات کی آفت نے نعیم اور عذرا کو اپنی گرفت میں لے لیا اور وہ خوشی خوشی جا کر موڑھوں پر بیٹھ گئے۔

ذہنی اور اعصابی آسودگی کے اس وقت میں نعیم نے اپنی بیوی کی بات کو لاپروائی سے سنا اور ٹال دیا۔ لیکن آنے والے دنوں میں عذرا کے حواس پر اس طاقت ور خواہش کا جادو سوار رہا اور ہر کام اور ہر بات اس نے بے خیالی اور بے دلی سے کی سوائے اس ایک بات کے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ نعیم پر بھی اس کا رنگ چڑھنے لگا۔

وہ اس انکوائری کمیٹی میں شامل کر لیا گیا جو انڈین نیشنل کانگرس نے غیر سرکاری طور پر امرتسر فائرنگ کی تفتیش کے لئے مقرر کی تھی اور مارشل لاء کی پابندیاں ہٹتے ہی وہ امرتسر پہنچے۔

(۱۹)

’’یہ ہے وہ جگہ۔‘‘ کھدر پوش بڈھے نے ہاتھ سے اشارہ کر کے انہیں بتایا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں انہوں نے سارا دن بسر کیا تھا اور اس سے پہلے کئی ایسے دن گزارے تھے۔ ایک کھلی سی جگہ کے گرداگرد چار فٹ اونچی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں کنواں کھدا تھا۔ یہ جگہ تین اطراف سے

اونچے اونچے سہ منزلہ مکانات میں گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف سے راستہ باہر کو نکلتا تھا۔ یہ جگہ جو جلیانوالہ باغ کہلاتی تھی، باغ سے زیادہ مویشی باندھنے کا باڑہ معلوم ہوتی تھی۔ یہاں پر انہوں نے پچھلے چند روز فائرنگ کے سلسلے میں اخباری نمائندوں، سیاسی ورکروں، تاجروں اور وکیلوں کے بیانات قلمبند کرنے میں صرف کیے تھے۔ لیکن آج اتفاق سے راستے میں نہیں یہ بوڑھا مچھلی فروش مل گیا تھا جو باتیں کرنے کے شوق میں اس وقت انہیں وہاں لے آیا تھا جب کہ ان کے پاس کاغذ اور پنسل ختم ہو چکے تھے۔

وہ ٹھگنے جسم اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ پاؤں والا کبڑا بڈھا تھا جس کی کمر کے خم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ پیدائشی تھا یا بڑھاپے کی وجہ سے نمودار ہوا تھا۔ اس کا لباس خستہ حالت میں تھا اور جسم سے مچھلی کی بو آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اور داڑھی کے بال بھی گندے تھے۔ لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی توانائی اور معصومیت تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اکیلے پیدا ہوتے ہیں اور اکیلے ہی مر جاتے ہیں مگر جنہیں اپنی سادگی اور خوش دلی کی بنا پر لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور باتیں کرنے کے کافی مواقع میسر آتے ہیں۔

ان کے دیکھتے دیکھتے وہ نوجوانوں کی طرح اچک کر دیوار پر چڑھا اور دونوں پاؤں جوڑ کر آرام سے بیٹھ گیا۔

''یہ ہے وہ جگہ میرے بچو۔'' اس نے اسی انداز میں ہاتھ پھیلا کر دہرایا۔

ڈھلتی ہوئی زرد دھوپ میں سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے لیکن جلیانوالہ باغ پر مکمل ویرانی تھی۔ صرف وہ گورے سپاہی [illegible] دیوار پر [illegible] جال خوردہ بڈھے کو اس کے ساتھیوں نے اشتیاق سے دیکھا اور انہیں محسوس ہوا کہ وہ ایک اجاڑ اور خشک سمندر کے کنارے پر کھڑے ہیں اور تہہ میں ڈوبے ہوئے شکستہ جہاز اور کشتیاں ننگی ہو گئی ہیں۔

عذرا نے سہم کر دونوں ہاتھ دیوار پر رکھے۔ ''ہمیں سب کچھ بتاؤ مچھلی والے۔'' اس نے کہا۔

''ہمیں سب کچھ بتاؤ جو ہوا بوڑھے مچھلی والے۔'' ان سب نے کہا۔

''میں تو مچھلی بیچتا ہوں بچو! شروع سے۔ جب میں پیدا ہوا، نہیں، بلکہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ کیونکہ جب میں پیدا ہوا اس وقت تو میرا باپ مچھلی بیچتا تھا اور میری ماں انہیں نمک لگایا کرتی تھی تاکہ وہ تازہ رہیں اور ان میں سڑاند پیدا نہ ہو۔ وہ بڑی اچھی اور نیک دل عورت تھی۔ میرا باپ اسے پیٹا کرتا تھا اور وہ مجھے پیٹتی تھی۔ لیکن سال کا زیادہ تر حصہ ہم امن اور سکون کے ساتھ رہتے تھے۔ مار پیٹ صرف اس وقت ہوتی تھی جب مچھلیاں میرے باپ کے ساتھ نہ لگتیں۔ مجھے یاد ہے کہ گرمیوں کا موسم جنگ اور مصیبت کا زمانہ ہوتا جبکہ دریا میں سیلاب آ جاتا اور مچھلیاں گدلے پانی میں بہت نیچے چلی جاتیں اور جال کے پھندے میں نہ آتیں۔ پھر میرا باپ سخت خفا ہوتا۔ دریا میں وہ مچھلیوں کو کوستا اور جال کو اور کشتی کو اور سورج کی تپش کو کوستا اور برابر غصے سے میری جانب دیکھتا جاتا اور مجھے ٹھونکنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا۔ لیکن میں ہمیشہ اس کے پنجے سے بچ نکلتا کیونکہ میں اس کی طرف پیٹھ کر کے چپو چلاتا جاتا اور اس کے کوسنے ایک کان سے سن کر دوسرے کان اڑا دیتا اور جب کنارا آتا تو پوری قوت

سے دوڑتا اور جلد ہی اس کی زد سے باہر ہو جاتا۔ پھر میں تمام دن گھر کا رخ نہ کرتا کیونکہ مجھے علم ہوتا کہ وہاں افراتفری کا عالم ہوگا۔ میں مچھیروں کی جھونپڑیوں سے پرے پرے گندے پانی کے گڑھوں پر مارا مارا پھرتا اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑ کر چباتا رہتا۔ سیلاب کے دنوں میں میں ہمیشہ نمک کی ڈلی جیب میں رکھتا کیونکہ کچی مچھلیاں نمک کے بغیر آسانی سے نہیں کھائی جا سکتیں۔ پہلے پہل کچھ دقت ہوئی پھر بعد میں عادت ہو گئی اور میں مزے لے لے کر انہیں کھانے لگا۔ وہ میرے جسم میں بے انتہا گرمی اور خون پیدا کرتیں۔ پھر شام ہونے پر میں گھر جاتا اور دروازے کے باہر اندھیرے میں کھڑے ہو کر دیکھتا۔ ماں کی سوجی سوجی آنکھیں دیکھ کر مجھے علم ہو جاتا کہ اس کی ٹھکائی ہوئی ہے۔ جب میں باہر کھڑا کھڑا اونگھنے لگتا تو اپنے کتے کے پلے کو زمین پر دے مارتا جس پر وہ چیخنے لگتا اور میری ماں کو میری آمد کا پتا چل جاتا۔ لیکن وہ کافی ہوشیار عورت تھی اس لئے وہ بہانے بازی سے کام لے کر پیار بھری آواز میں مجھے پاس بلاتی اور کوئی کام کرنے کو کہتی مثلاً یہ کہ کتا سویرے سے بھوکا ہے۔ اس کے لئے مچھلی لے جاؤ۔ جب میں اندر داخل ہوتا تو وہ دروازے کی اوٹ میں سے نکل کر مجھے پکڑ لیتی اور میرے کان مروڑتی اور آنکھیں نکال کر مجھ پر چیختی اور مجھے آوارہ گرد، کام چور اور بدبخت کے ناموں سے پکارتی۔ یہ تقریباً وہی نام تھے جن سے میرا باپ ٹھونکتے وقت اسے مخاطب کیا کرتا تھا۔ پھر وہ میرے منہ پر زور زور سے طمانچے مارتی۔ پہلے پہل میں چیخ چیخ کر رویا کرتا لیکن بعد میں جب میں عادی ہو گیا تو جھوٹ موٹ شور مچا مچا کر آسمان سر پر اٹھا لیتا اور میرا باپ نیند سے [illegible] ہم دونوں کو گالیاں دیتا۔ وہ چونک [illegible] آفت [illegible]

ایک بار جب سیلاب بہت عرصے تک جاری رہے اور مفلسی کے مارے ہمارا برا حال ہو گیا اور ہمارے سارے کتے فاقے سے مر گئے تو میرا باپ بے حد چڑچڑا ہو گیا اور بہانہ تلاش کرنے کی تکلیف کے بغیر مجھے پیٹنے لگا۔ تب میں نے ایک تجویز سوچی۔ ایک روز جب حسبِ معمول جب کوئی مچھلی ہمارے ہاتھ نہ لگی تو میرے باپ نے خالی جال کشتی میں دے مارا اور ساری دنیا کو کوستے ہوئے میرے سر پر کھڑا ہو کر مجھے ٹھونکنے کی تیاری کرنے لگا۔

میں نے چپو سر سے اوپر اٹھا کر اپنا بچاؤ کیا اور کہا:

''ٹھہرو بابا۔ میری بات سنو!''

''اس نے ہاتھ روک لیا اور خفگی سے چھینکیں مارتا اور کھنکارتا ہوا مجھے گھورنے لگا۔ میں نے کہا: ''دیکھو، اگر تم مجھے مارو گے تو میں کشتی نہیں چلاؤں گا۔''

''میں خود کشتی چلا لوں گا۔'' اس نے سڑیل مزاجوں کی طرح جواب دیا۔

''اور مچھلیاں کون پکڑے گا۔'' میں نے حیلہ جوئی کی۔

''مچھلیاں؟'' اس نے داڑھی میں انگلیاں ڈال کر سوچا۔ پھر کوسنے دے کر کہنے لگا: ''مچھلیاں ملتی کہاں ہیں۔'' میں نے فوراً کہا: ''جب سیلاب کم ہو گا؟ پھر پھر کون پکڑے گا؟''

وہ اسی طرح داڑھی میں انگلیاں ڈالے سوچتا رہا۔ پھر خاموشی سے جا کر جال پر بیٹھ گیا۔ میری بات اس کی

سمجھ میں آ گئی کیونکہ اس کے بعد اس نے کبھی مجھ پر ہاتھ نہ اٹھایا۔

''لیکن بدامنی کا زمانہ زیادہ دیر تک نہ رہتا۔ کیونکہ جاڑوں کی آمد کے ساتھ ساتھ پہاڑوں پر برف پھسلنی بند ہو جاتی اور دریا کا پانی صاف ہو جاتا اور مچھلیاں اوپر آ جاتیں اور ایک بار پھر ہمارے پاس سینکڑوں کی تعداد میں مچھلیاں جمع ہو جاتیں جنہیں میری ماں نمک لگا کر خشک کرتی اور بوریوں میں بھر دیتی اور ہم چند نئے کتے پال لیتے اور میرا باپ خوش مزاج ہو جاتا اور ہم تمام جاڑے خزاں اور بہار کے موسم مکمل صلح کے ساتھ شریف اور امیر لوگوں کی طرح بسر کرتے' اور ہر روز شام کے وقت میری ماں آگ کے سامنے بیٹھ کر ہاتھ باندھ کر چھت کی طرف دیکھتی اور کہتی: 'میرا شکر ہے مالک کہ سیلاب گرمیوں میں آتے ہیں اور جاڑوں میں نہیں آتے ورنہ اگر سردیوں میں مچھلی نہ ملے تو پھیپھڑے کا بخار ہو جائے یا جوڑوں میں درد شروع ہو جائے اور اوپر سے ٹو ٹو میں میں جو ہو وہ الگ' تیرا شکر ہے' اپنی پنائی کو وہ ہمیشہ ٹو ٹو میں میں کے نام سے یاد کرتی۔''

بڈھا سانس لینے کے لیے رکا تو پانچوں سننے والوں نے شدید بے چینی کا اظہار کیا اس سے واضح تھا کہ اس کی بے تکی باتوں نے انہیں پریشان کر رکھا تھا۔

''ہمیں فارنگ کے متعلق بتاؤ' مچھلی والے۔'' سب نے ایک ساتھ کہا۔

''ٹھہرو۔'' بڈھے نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے کہا۔ ''سب کچھ بتاؤں گا۔ رات کے آٹھ بجے تک ہم یہاں [illegible] ورنہ اس شہر میں ایک سے ایک ہولناک ہو رہا ہے۔ جس کسی سے بات کرو لگتا ہے جیسے قبر سے اٹھ کر آ رہا ہے اور بول نہیں سکتا۔ حالانکہ میں نے اس سے کہیں زیادہ آدمی وبا میں مرتے ہوئے دیکھے ہیں۔ تو میں اپنی ماں کی بات کر رہا تھا۔ وہ بڑی نیک دل' ہوشیار اور خدا پرست عورت تھی لیکن وہ جلد ہی مر گئی اور اس کا سارا کام ہمارے گلے پڑ گیا۔ پھر ہمیں اس کی قدر و قیمت معلوم ہوئی۔ اب میرا باپ اکیلا ہی کسی نہ کسی طرح سے مچھلیاں پکڑ کر لاتا اور میں ان کو نمک لگا کر دھوپ اور چھاؤں میں سکھاتا اور تھیلوں میں بھرتا۔ رات کو ہم آمنے سامنے بیٹھ کر خشک مچھلیاں مرچوں کے ساتھ کھاتے۔ میرے باپ کو بڑھاپے کی وجہ سے کبھی کچی مچھلیاں کھانے کی عادت نہ پڑ سکی اور وہ جب تک زندہ رہا اسی تکلیف میں مبتلا رہا۔ لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ آگ جلانے میں ہم میں سے کوئی بھی ماہر نہ تھا۔ مجھے مزے لے کر مچھلیاں چباتے ہوئے دیکھ کر وہ انتہائی خفا ہوتا اور کہتا: 'جانور کے بچے' مگرمچھ کے بچے' کیسے مزے لے رہا ہے!' اس پر میں ہنس کر کہتا: 'بابا تم مچھیرے ہو اور مچھلی نہیں کھا سکتے۔ کیسے مچھیرے ہو!''

''میں انسان کی اولاد ہوں' جانور کی اولاد نہیں ہوں'' وہ کہتا۔ کبھی کبھی اسے جلانے کے لیے میں کہتا: میں زندہ مچھلی بھی کھا سکتا ہوں۔ تم کھا سکتے ہو؟'

''چپ رہو۔ تم بکتے ہو'' وہ کہتا۔

''اچھا؟' میں کہتا۔ 'تو یہ لو' یہ کہہ کر میں لکڑی کی بالٹی میں جس میں میں مچھلیاں پالا کرتا تھا' ہاتھ ڈال کر

UrduPhoto.com

ایک زندہ مچھلی نکالتا اور منہ میں پکڑ لیتا۔ میرے دانتوں کے درمیان تڑپتی ہوئی مچھلی کو دیکھ کر وہ غصے سے پاگل ہو جاتا اور ایک لمبی سی خشک مچھلی اٹھا کر میرے پیچھے دوڑتا۔ میں خشک مچھلی کے ڈر سے جو کہ بید کی طرح لگتی ہے باہر بھاگ جاتا اور اندھیرے میں کھڑا ہو کر اس کی غصیلی آواز سنتا رہتا: 'کیسا زمانہ آگیا ہے۔ سانپوں اور سؤروں کے بچے انسانوں کے گھر پیدا ہونے لگے ہیں۔ ایسا بھی سنا تھا! زندہ مچھلی کو۔ زندہ آدمی کھاتا ہے۔ ایک زندگی دوسری زندگی کو' میں باہر کھڑا ہو کر خاموشی سے ہنستا اور مچھلی کھاتا رہتا۔" بڈھا بازو ہوا میں پھیلا کر ہنسا جس سے اس کے آخری تین دانت' جو اس کے منہ میں رہ گئے تھے' ننگے ہو گئے اور آنکھوں کے گرد جھریاں پڑ گئیں۔ اس کی باتوں میں دلچسپی محسوس کرنے کے باوجود بیتنے والے وقت کی کمی کی وجہ سے گھبرائے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ ادھر ادھر کی باتیں چھوڑ کر جلد اصل موضوع پر آجائے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں بڈھے نے بات جاری رکھی:

"لیکن جلد ہی ہمیں پتہ چل گیا کہ گھر کا کام چلانے میں ہم کس قدر ناکام رہے ہیں۔ تمام مچھلیاں جو میں سکھا کر بوریوں میں بھرتا دو دن کے بعد وہ سڑنے لگتیں اور انہیں گھر میں رکھنا مشکل ہو جاتا۔ چونکہ بیچنے کے قابل بھی نہ ہوتیں اس لیے جتنی ہم کھا سکتے ایک دو روز میں جلد جلد کھا لیتے' باقی گلی سڑی مچھلیاں دریا میں بہا دیتے۔ اس کے بعد میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ہماری روزانہ کی آمدنی میں نمایاں کمی ہوتی جا رہی ہے اور ایک وقت آیا کہ جتنی مچھلی گھر میں آتی روز کی روز ہم ہضم کر جاتے۔ خشک مچھلی کے مقابلے میں میرے باپ کو تازہ کچی مچھلی زیادہ بھاتی جس کی چربی زیادہ [illegible] لاکر [illegible] کر جاتا۔ میں نے سوچا یوں کام نہیں چلے گا۔ آخر ایک دن پھوا اپنے باپ کی نا اہلی پر جھلا کر میں نے جھونپڑی کا دروازہ بند کیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

"ماگھ کا مہینہ تھا' یا شاید پھاگن کا۔ مجھے یاد ہے پہاڑوں پر برف جمی تھی اور دریا کا شفاف پانی تہہ کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس میں دوڑتی بھاگتی ہوئی مچھلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں کشتی چلا رہا تھا اور میرا باپ میری طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بڑھاپے کی وجہ سے اس کی ٹانگیں ٹیڑھی ہو چکی تھیں اور ان پر زرد زرد نسیں ابھر آئی تھیں۔ لیکن موسم بڑا شاندار تھا۔ دریا اور آسمان کا رنگ گہرا نیلا تھا اور ہوا ہمارے بال اڑا رہی تھی اور میرے باپ کے اڑتے ہوئے بال برف کی طرح سفید تھے اور دھوپ میں خوش نما لگ رہے تھے اور ہوا کی وجہ سے جو ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں ان پر ہماری کشتی ڈول رہی تھی۔ چلتے چلتے ہم مچھلیوں کے خطے میں داخل ہوئے۔ یہاں پر دریا کنارے کو کاٹتا ہوا بہت اندر تک چلا گیا تھا اور ٹھہرے ہوئے پانی کی ایک ننھی سی جھیل کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہاں پر ہم نے ہزاروں کی تعداد میں مچھلیاں دیکھیں۔ رنگ برنگ کی چھوٹی بڑی قسم قسم کی مچھلیاں پانی میں کھیل رہی تھیں اور دھوپ چھن چھن کر ان کے جسموں پر پڑ رہی تھی۔ میرے باپ نے جال پھینکا۔ مچھلیوں میں افراتفری مچ گئی۔ جال میں بہت سی بڑی بڑی مچھلیاں آئیں اور انہیں کشتی میں لاد کر ہم واپس لوٹے۔ میں بے حد خوش تھا اور تیز تیز چپو مار رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے باپ نے جال میں ہاتھ ڈال کر کلبلاتے ہوئے

ڈھیر میں سے ایک مچھلی نکالی اور اسے ہاتھ میں پکڑے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ وہ بڑی خوبصورت مچھلی تھی۔ اس کا رنگ گہرا نیلا اور اوپر بڑے بڑے سنہری رنگ کے چانے تھے۔ وہ گردن کے پر پھلا پھلا کر سانس لے رہی تھی اور کھلی ہوئی آنکھوں سے جانے کدھر دیکھ رہی تھی۔

''پانی خوبصورت ہے۔'' میرے باپ نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا گھر بدصورت ہے۔ تو اپنے گھر جا۔'' میرے باپ نے کہا اور ہاتھ لٹکا کر اسے پانی میں چھوڑ دیا۔ مجھے اس کی اس احمقانہ حرکت پر بڑا تاؤ آیا اور میں نے اسے متوجہ کرنے کو ناک میں سے آواز نکالی۔ لیکن وہ گہری سوچ میں تھا۔ پھر اس نے دوسری مچھلی اٹھائی۔ اس کا جسم قرمزی رنگ کا تھا اور اوپر سیاہ لکیریں تھیں اور اس کی آنکھوں کا رنگ سرخ تھا اور دم بھی سرخ تھی۔ ''تم خوبصورت ہو۔ میرا گھر بدصورت ہے۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ'' میرے باپ نے کہا اور اسے بھی چھوڑ دیا۔ پانی میں داخل ہوتے ہی مچھلی نے تیزی سے دم چھلکی اور تہہ میں چلی گئی۔ پھر میرے باپ نے ایک اور مچھلی اٹھائی جس کی جلد سفید ریشم کی طرح تھی اور جس پر دنیا کے ہر رنگ کے نقطے اور لکیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کا سر اور آنکھیں اور ہونٹ بھی سفید تھے۔ میرے باپ نے پیار [illegible] کر اسے بھی چھوڑ دیا: ''تم بھی خوبصورت ہو۔ تم بھی اپنے گھر جاؤ۔ مجھے پیٹ بھرنے کے لیے بس چند ایک [illegible] کی اور بدصورت مچھلیوں کی ضرورت ہے۔''

غرض [illegible] کنارے پر پہنچنے سے پہلے پہلے تمام عمدہ عمدہ مچھلیاں اس نے ضائع کر دیں۔ میں [illegible] خاموش بیٹھا دل ہی دل میں [illegible] مجھے [illegible] نقصان کا [illegible] معلوم ہو گیا ہے۔

کنارے پر اتر [illegible] میں نے اس سے کہا۔ ''دیکھو بابا۔ تم کل سے گھر پر رہو گے۔ دریا پر میں جاؤں گا۔''

''کیوں [illegible] نے خشکی سے پوچھا۔

''کیوں؟'' میں چیخ کر بولا۔ ''تم ساری مچھلیاں تو ضائع کر دیتے ہو۔ کیوں!'' میں غصے سے کانپ رہا تھا۔ میری عمر اس وقت گیارہ برس کی تھی لیکن میرے تیور دیکھ کر وہ ڈر گیا اور خاموشی سے سر جھکا کر آگے چلنے لگا۔ راستے میں اس نے مجھ سے صرف اتنا کہا: ''جب تم بوڑھے ہو جاؤ گے اور تمہاری عورت مر جائے گی تو تمہیں پتا چلے گا۔'' میں غصے میں تھا اس لیے اس کی بات کے جواب میں خاموش رہا۔

''اس کے بعد وہ ہمیشہ گھر پر رہتا اور میں دریا پر جاتا۔ ہمارے پاس پھر مچھلیوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا اور مچھیروں کی بستی میں ہم ایک بار پھر متمول خاندانوں میں شمار ہونے لگے۔ مگر اب میرا باپ روز بروز بوڑھا اور اندھا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سارا سارا دن چھاؤں میں مچھلیوں کو پھیلا کر ان کی رکھوالی پر بیٹھا رہتا اور دوسرے مچھیروں کو لڑنے جھگڑنے سے منع کرتا اور جو لوگ اپنی عورتوں کو پیٹتے ان کو نصیحت کرتا کہ عورتوں کو پیٹنا نہیں چاہیے ورنہ وہ مر جاتی ہیں اور پھر بڑھاپے میں کچی مچھلیاں کھانے کی لعنت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

''اسی طرح جب میں سنِ بلوغت کو پہنچا تو وہ مر گیا۔'' بڈھا سانس لینے کے لیے رکا اور سادگی سے ہنس کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے تین دانت پھر نمودار ہو گئے۔ اب وہ سب اس بڈھے کے باتونی پن اور اس کی

باتوں سے اکتا چکے تھے اور نعیم تو اس سے کوئی فائدہ مند تفصیلات حاصل کرنے کی امید قطعی طور پر کھو چکا تھا۔ صرف عذرا' جسے نعیم یا اس کے ساتھیوں کے کام سے زیادہ سروکار نہ تھا' اس سے دلچسپی لے رہی تھی۔

"پھر' مچھلی والے؟" عذرا نے کہا۔

"ہمیں تیرہ اپریل کا واقعہ بتلاؤ' مچھلی والے' ورنہ ہم چلے جائیں گے۔" مردوں میں سے ایک نے کہا۔

"اوہ اچھا اچھا۔ میں آٹھ بجے سے پہلے پہلے سب کچھ بتا دوں گا۔ میرے بچو۔ گھبراؤ مت' کیونکہ آٹھ بجے تمہیں چلے جانا ہو گا۔ اس وقت یہاں کرفیو شروع ہو جاتا ہے۔ جب میرا باپ مر گیا تو میں اکیلا رہ گیا۔ پھر میں نے گھر کے کام کے لیے ایک عورت کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن بدقسمتی سے میرا قد بہت چھوٹا رہ گیا تھا۔ جو بھی عورتیں مجھے ملیں بہت قد آور نکلیں اور انہوں نے میرے ساتھ رہنا پسند نہ کیا۔ جو دو ایک عورتیں راضی ہوئیں وہ بدمزاج نکل آئیں' اور بدمزاج عورتیں تم جانتے ہو بچو' مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ کچھ عرصے کے بعد میں نے عورتوں کی تلاش میں وقت ضائع کرنا ترک کر دیا۔ پھر میں نے اپنے باپ کی ٹوکری نکالی اور اس میں روزانہ کی تازہ مچھلیاں ڈال کر بیچنے لگا۔ اب گھر کا کوئی کام نہ تھا اور عورت کی ضرورت نہ تھی۔ میں خوشی خوشی اکیلا رہنے لگا اور اب تک رہتا ہوں۔ میرے پاس اب بھی میرے باپ کی ٹوکری ہے' جس میں میں مچھلیاں بیچتا ہوں' حالانکہ اپنا گاؤں چھوڑ کر اب میں اس شہر میں آ گیا ہوں۔ میں نے آج تک پکی مچھلی اور ابلی ہوئی مکئی کے سوا کچھ نہیں کھایا۔ میں اس وقت تک اپنے باپ کی [illegible] میں نے [illegible] بڑے موقعے دیکھے ہیں۔ سن ستاون کا غدر' جب میرا باپ نیا نیا فوت ہوا تھا' اور اس صدی کے شروع کا سرخ بخار' اور...... اور' لیکن تم لوگ چونکہ اس واقعے کا اصرار کرتے ہو اس لیے میں تمہیں اسی کا قصہ سناؤں گا۔' میں اس دن کی اور اس سے پہلے کئی دن کی ایک ایک بات بتا سکتا ہوں۔ سن ستاون کے پچاس برس کے بعد غدر کی ایک ایک بات سن کر ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا' تم کیا کھاتے ہو؟ میں نے بتایا: 'مچھلی اور ابلی ہوئی مکئی' تو وہ کہنے لگا: اسی لیے تم عقل مند آدمیوں میں سے ہو۔" بڈھے نے بیٹھے بیٹھے کمر سیدھی کی اور اندھیرے میں اس کے تین سفید دانت دکھائی دیے جس سے سننے والوں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے سادہ بے تکلف اور متکبرانہ انداز میں ہنس رہا تھا۔ "پیر' اپریل کی تیرہ تاریخ.......' "ہاں' جی چاہتے مہینے کے نویں دن ہی شروع ہو گئی تھی جب شہر کے چار بازاروں میں نو انگریزوں کو مار دیا گیا۔ ہر بات میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ انہوں نے مجھے ٹھہرایا۔ وہ دو تھے۔ میں نے سمجھا مچھلی کے گاہک ہیں۔ خوشی خوشی میں نے ٹوکری نیچے رکھی۔ ایک وہیں کھڑا رہا' دوسرا کیمرہ آنکھ سے لگائے لگائے پیچھے ہٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔ وہاں کھڑے ہو کر اس نے تصویریں لیں۔ پھر جیب سے چاندی کا ایک سکہ نکال کر میری طرف اچھالا۔ سکہ ذرا غلط نشانے پر پڑا اور میں نے پاگلوں کی طرح ناچ ناچ کر اور گھوم گھوم کر اسے ہوا میں پکڑنے کی کوشش کی۔ اس نے اور تصویریں لیں۔ آخر سکہ زمین پر گر پڑا۔ جب میں اسے اٹھا چکا تو وہ جا رہے تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے۔ اب۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے گلی کے موڑ سے دو آدمی ان پر حملہ آور ہوئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ایک کی تلوار